ĪQĀN Vol. 06, No. 02, Jun-2024

eISSN: 2617-3336
pISSN: 2617-3700

مطالعہ مذاہب میں مسلمان علماء کا معروضی منہج

Objective Approach of Muslim Scholars in the Study of Religions

Syed Adeel Shah*[1], Dr. Misbah Fatima [2], Abdul Rahman[3]

[1] *PhD Scholar, Department of Islamic Studies, Al-Hamd Islamic University, Islamabad*
[2] *Assistant professor, Islamic Studies, Government Graduate College, Bosan Road, Multan*
[3]*MS Scholar, Department of the Study of the Religion, Faculty of Usuluddin, International Islamic University, Islamabad*
Correspondence: syedadeelahmedgilani@gmail.com

DOI: https://doi.org/10.36755/iqan.v6i2.454

ABSTRACT

An impression is given by the people of the West that the objective approach of the study of religions has not been prevalent among Muslims. On the contrary, the determination of the purpose has been done first and the research activity has been implemented later. The review of this Western claim has been presented in this paper. Two Muslim thinkers have been selected in this regard, of which Abu Al-Hasan al-Amiri (381 AH/992 AD) is related to the early ones and Al-Sheikh Ahmad Shalabi (1421 AH/2000 AD) is related to the late ones.These two Muslim thinkers have presented their explanations on comparative religions and in this paper it is clarified that in the case of Abu al-Hasan al-Amiri, the objective approach to the study of religions was prevalent among Muslims in the past. Likewise, the same critical approach is also prevalent among recent Muslims. In this paper, Abu Al-Hasan al-Amiri's "Al-Alam Bumnaqib al-Islam" and Al-Shaykh Ahmad Shalabi's "Maqaran al-Idyan" have been made the focus of study.

Received: 29-07-2024
Accepted: 06-08-2024
Online: 15-09-2024

KEYWORDS
Muslim, Comparative Religions, Christianity, Judaism, Objective Approach, Al-Amiri, Al-Shalabi

اہل مغرب کی جانب سے ایک تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ مطالعہ ادیان کا معروضی منہج مسلمانوں میں مروج نہیں رہا ہے۔اس کے برعکس ان کے ہاں مقصد کا تعین پہلے اور تحقیقی سرگرمی بعد میں عمل میں آتی رہی ہے۔اس مغربی مقدمہ کا جائزہ اس مقالہ میں پیش کیا گیا ہے۔اس

ضمن میں دو مسلمان مفکرین کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں سے ابو الحسن العامریؒ (۳۸۱ھ / ۹۹۲ء) کا تعلق متقدمین سے اور الشیخ احمد شلبیؒ (۱۴۲۱ھ / ۲۰۰۰ء) کا تعلق متاخرین کے ساتھ ہے۔ان دونوں مسلمان مفکرین نے تقابل ادیان پر اپنی تصریحات پیش کر رکھی ہیں اور اس مقالہ میں واضح کیا گیا ہے کہ ابو الحسن العامریؒ کی صورت میں ماضی میں مطالعہ ادیان کا معروضی منہج مسلمانوں میں مروج تھا۔اسی طرح متاخرین مسلمانوں میں بھی یہی تنقیدی منہج اختیار کیا گیا ہے۔مقالہ ہذا میں ابو الحسن العامریؒ کی "الاعلام بمناقب الاسلام" اور الشیخ احمد شلبی کی "مقارنۃ الادیان" کو مطالعہ کا محور بنایا گیا ہے۔

معروضیت منہج کا مفہوم

معروضیت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی بھی چیز یا علم کو تعصب، تنگ نظری یا مذہبی و ثقافتی میلان کے بغیر ایسے دیکھنا اور بیان کرنا، جیسے وہ ہے۔اس میں ایسے طریقے اور اقدامات اختیار کیے جاتے ہیں جو موضوعیت اور بیرونی و خارجی اثرات سے پاک ہوتے ہیں اس لیے یہ کسی بھی چیز یا نظریے کی حقیقت کو پہچاننے میں اساسی و بنیادی کردار ادا کرتے ہیں[۱]۔

معروضیت سے متعلق مندرجہ بالا دونوں نکات بنیادی طور پر مذہبی علوم اور علومِ بشریات کے مطالعہ کے لیے جرمن فلسفی "ایڈمنڈ ہسرل" (Edmund Husserl) اور "ماکس شیلر" (Max Scheller) کے خیالات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ان دونوں مفکرین کا خیال ہے کہ مظاہر کا توضیحی مطالعہ اس انداز میں کرنا چاہیے جیسے وہ زمان و مکان پر ظاہر ہوتے ہیں[۲]۔

اس مطالعہ میں متعلقہ میدان میں موجود جواہر کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے محقق کو مکمل طور پر غیر جانب دار رہنا چاہیے اور یہی اس کا فرض منصبی ہوتا ہے[۳]۔

مسلمان علماء کی پیش کردہ اسلامی تراث میں معروضیت کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی ہے۔تاہم اس اصطلاح کے مفہوم کے تمام اجزاء اسلامی علوم میں مستعمل اصطلاحات کے مفاہیم میں موجود ہیں۔ان اجزاء میں عدل و انصاف کا پاس رکھنا اور کسی بھی مذہبی، ثقافتی یا تہذیبی جانب داری و میلانات سے دور رہنا شامل ہے[۴]۔

---

[۱] عامر الحافی، الموضوعیۃ فی دراسۃ الادیان، مجلۃ اسلمۃ المعرفۃ، المعہد العالمی للفکر الاسلامی، (۲۰۱۰ء)، شمارہ ۶۰، ص ۱۳۲

[۲] محمد، سماح رافع، الفینومینولوجیا عند ھوسرل، دار الشؤون الثقافیۃ العامۃ، بغداد، (۱۹۹۱ء)، ص ۹۵-۹۶۔

[۳] ایضاً، ص ۹۶۔

[۴] الموضوعیۃ فی دراسۃ الادیان، ص ۱۳۲۔

اس نوعیت کے منہج کو اختیار کرنے سے حاصل ہونے والے نتائج ہر قسم کے موضوعی اثرات اور شخصی میلانات سے پاک ہوتے ہیں۔ایسے نتائج فرد کی خیالی یا جذباتی کیفیت کی تشریح کے بجائے اپنی حقیقی صورت اور ساخت و پرداخت کی عکاسی کرتے ہیں۔ معروضی تحقیق کے اختتام پر محقق ایسی کوئی بات، عقیدہ یا مؤقف عمداً و قصداً تحقیق کے نتائج پر مسلط نہیں کرتا جو نتائج تک پہنچنے میں کارفرما اعداد و شمار یا حقائق کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں معروضیت کا مطلب یہ ہے کہ اس میں علم اور اس کے شواہد سے اخذ کردہ نتائج کو فرد کی ذاتی تشریحات، تجزیات یا جذباتی ردعمل کے تابع نہیں کیا جاتا ہے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ معروضیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ منصفانہ تجزیہ، عاجزی، دوسروں کا احترام، نیک نیتی اور عقل مندی جیسے مثبت اخلاقیات کو ترک کر دیا جائے۔ یہ اخلاقیات نئے علم کے حصول اور ان میں موجود سچائیوں کو تسلیم کرنے کے لیے ضروری تحفظات کے طور پر کام کرتے ہیں[۵]۔ علوم انسانی کے نتائج و افکار کے بیان میں عدل و انصاف سے کام لینا ضروری ہے تاکہ مطالعہ کے حقیقی مقصد پر کوئی منفی اثر نہ پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ حقائق کا غلط فہم و ادراک فسطائیت کا باعث بن جاتا ہے۔ **اسی لیے** علوم انسانی میں معروضیت کے مطالعہ کا مفہوم یہ سمجھا جاتا ہے نتائج ایسی علمی بنیادوں پر مبنی ہوں جس پر تمام لوگ یا اکثریت متفق ہو۔[۶]

معروضی منہج میں تاریخیت کی بحث

سیکولر مفکرین کا خیال ہے کہ علوم انسانی میں معروضی مطالعہ تاریخی شواہد پر مبنی ہوتا ہے۔ تاریخی شواہد ہمیشہ کسی بھی چیز کے اندر موجود مظاہر کی توضیح و تشریح کرتے ہیں لیکن اس فکر کے ساتھ مذہبی علماء (بالخصوص علماء) متفق نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عقائد اور مذہبی امور کی شریح کے لیے تاریخی منہج کو یہودیت یا عیسائیت کے لیے ضرور اختیار کیا جاسکتا ہے لیکن اس کا اطلاق اسلام پر نہیں کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی یہ ممکن اور قابل قبول ہو گا۔ معروف مستشرق "ہیملٹن گب"(Gibb) کے مطابق:

> "مذہب اور مذہبی فکر کا بہت سے مختلف زاویوں سے مطالعہ کرنا درست ہے۔ ان زاویوں کو دو بڑے رجحانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یہ نظریاتی اور سائنسی و تاریخی نقطہ نظر ہیں[۷]"۔

تاریخی رجحان کو مد نظر رکھ کر اسلام کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مسلمان مصنفین کی کتابیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اسلام اور بعض

---

[۵] ایضاً۔

[۶] ابوالحسن محمد بن ابی ذر یوسف العامریؒ، الاعلام بمناقب الاسلام، دار الاصالۃ الریاض (۱۹۹۸)، ص ۱۲۵

[7] Hamilton Gibb, The Study of Religions and the Structure of Islamic Thought), Arabic Translation, Dar ul Fikar, Berute, (1977), P. 11,37

طبقات کے مسلمانوں کے درمیان ایک نظریاتی الجھن موجود رہی ہے۔ ایسے مصنفین مسلمانوں کے فکری، عملی اور اظہاری ورثے کو خود اسلام کے موروثی اجزاء کے طور پر سمجھتے ہیں اور وہ اسی پیرائے میں عیسائیت اور یہودیت کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ لیکن یہ مصنفین چونکہ یہودیت اور عیسائیت، دونوں کو تاریخ کی میزان پر رکھ کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے وہ مطالعہ اسلام میں نصوص پر تفکر و تدبر کرنے کے بجائے، یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں جس کی بنا پر فہم اسلام میں ان کا منہج ناقص ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کی نظر میں اسلام بھی یہودیت و عیسائیت کی مانند ایک مذہبی نظام ہے۔ حالاں کہ اسلام اپنے منشور میں قرآنی وحی کے ذریعے مکمل ہے۔ اس لیے حقیقی معروضیت کے لیے اسلام اور تاریخ اسلام کے درمیان فرق کرنے کی ضرورت ہے، مزید یہ کہ اسلام کو اس تاریخ کے جوہر، معیار اور کسوٹی کے طور پر دیکھنے کی بھی ضرورت ہے[۸]۔

مطالعہ ادیان کے معروضی منہج میں مسلمان علماء کا امتیاز

یہ ملحوظ رہے کہ عمومی دعوی یہ کیا جاتا ہے کہ مذاہب کا معروضی مطالعہ سب سے پہلے مغربی ممالک میں شروع ہوا تھا۔ مسلمانوں کے ہاں دیگر مذاہب کے مطالعہ کا منہج ہمیشہ موضوعی رہا ہے۔ یہ ایک غلط دعویٰ ہے کیونکہ مغربی دنیا میں مطالعہ مذاہب کا معروضی منہج اس وقت شروع ہوا تھا جب وہاں تحریک اصلاح کلیسا، تحریک تنویر، جدیدیت اور صنعتی انقلاب نے مذہبی طبقات کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیے تھے۔ مذہب بازیچہ اطفال بن گیا اور ہر کس و ناکس نے اس کی تضحیک شروع کر دی تھی۔ Biblical Criticism کے نام سے منصہ شہود پر آنے والی نئی سائنس نے بائبل کو ایک من گھڑت، متنازعہ، انسانی زندگی کے لیے مہلک اور ناقابل اعتماد کتاب قرار دیا تھا۔ Historical Jesus کے فلسفہ نے سرے سے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ انسانی تاریخ میں یسوع کے نام سے کوئی شخصیت تھی۔ شرچ کو ریاست سے الگ کر دیا گیا اور عیسائیت و یہودیت سمیت دنیا کے تمام مذاہب کا انکار کر کے الحاد کو فروغ دینا شروع کر دیا گیا تھا۔ اس عہد کے بعد مذاہب کا معروضی مطالعہ شروع کیا گیا تھا۔

دوسری طرف مسلمان دنیا میں مذاہب کا معروضی مطالعہ صدرِ اسلام سے ہی شروع ہو چکا تھا کیونکہ اس کی علمی و فکری بنیادیں خود قرآن مجید میں موجود ہیں۔ مثلا:

- قرآن مجید نے مذاہب عالم کے وجود کو تسلیم کیا۔
- جس معاشرے میں قرآن کا نزول ہوا وہ بذات خود کثیر المذہب معاشرہ تھا۔

---

[۸] اسماعیل الراجی الفاروقی، أطلس الحضارة الإسلامية، مكتبة العبيكان، رياض، (۱۴۱۸ھ)، ص۲۶-۲۷۔

- جن لوگوں کے ساتھ نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کا تعامل رہا ان کا تعلق الگ الگ مذاہب کے ساتھ تھا۔
- ان تمام باتوں پر مستزاد یہ کہ قرآن مجید میں کسی ایک مذہب کا نام لے کر اس کو برا بھلا نہیں کہا گیا بلکہ مذہبی اشرافیہ اور مذاہب کے پیروکاروں کے ان اعمال پر تنقید کی گئی ہے جو خلاف شرع ہیں۔
- قرآن مجید یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ انسانوں شروع میں ایک امت تھے، پھر لوگوں نے مذہبی اختلافات پیدا کر کے ان کی بنیاد پر انسانیت کو منقسم کر دیا اور یہ اختلافات ہمیشہ موجود رہیں گے۔ روز قیامت اللہ تعالیٰ ان اختلافات کے بارے میں حتمی فیصلہ صادر فرمائے گا۔

ان تمام امور سے مسلمان روز اول سے آگاہ تھے اس لیے ان کا مطالعہ مذاہب، اپنے برحق ہونے کے یقین کے باوجود، معروضی نوعیت کا تھا۔ یہ سچ ہے کہ مسلمانوں نے "الرد" کے نام سے بھی کتابیں لکھیں لیکن ایسی کتابیں عموماً غیر مسلم مناظرین کے جواب میں لکھی جاتی تھیں اور اس نوعیت کی کتابوں میں بھی مسلمانوں نے تعصب کے بجائے علمیت کو ہی ملحوظ رکھا ہے۔ اس نوعیت کے کلاسیکی مسلم ادب کی مندرجہ ذیل مثالیں قابل ذکر ہیں:

- ہاشم بن محمد الکعب (۸۲۱ھ) کی " کتاب الاصنام" اس کا انگریزی ترجمہ ۱۹۵۲ء میں پرنسٹن یونیورسٹی پریس سے شائع ہو چکا ہے۔
- ابو الفرج محمد ابن اسحاق ابن ندیم کی "الفہرست"۔ اس کتاب میں مذاہب سے متعلق مسلمان علماء کی کتابوں کا ذکر بغیر کسی تنقید و تنقیص کے موجود ہے۔
- ابوریحان البیرونی کی "تحقیق ما للهند من مقوله مقبوله فی العقل او مرذوله"۔ عرف عام میں اس کو "کتاب الهند" بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں البیرونی نے ہندومت سے متعلق غیر جانب دارانہ اسلوب میں اپنے مشاہدات، مطالعات اور تجربات بیان کیے ہیں۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔
- محمد بن عبد اللہ ابو المعالی کی "بیان الادیان"۔
- عبد الکریم شہرستانی کی "الملل و النحل"۔ اس کا بھی اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

مذکورہ کتابیں آٹھویں سے بارہویں صدی عیسوی کے دوران لکھی گئی تھیں اور مسلمان دنیا میں ان کو بڑے پیمانے پر مقبولیت ملی تھی۔ یہ وہ عہد تھا جب مغرب مطالعہ ادیان کے معروضی منہج کے حروف ابجد سے بھی آگاہ نہیں تھا۔

بعد کے زمانوں میں بھی مطالعہ مذاہب کی مسلم روایت میں اس منہج معروضیت کا بھرپور لحاظ رکھا گیا ہے۔ ماضی میں اس ضمن میں جن

مسلمان علماء کی کتابیں لائق التفات ہیں ان کی ایک بڑی تعداد ہے۔ اس ضمن میں تمام کتب کا ذکر کرنا ایک مستقل مقالے کا متقاضی ہے۔ مذاہب کو پڑھنے اور سمجھنے کی مسلمانوں میں کس قدر اہمیت تھی؟ اس کا انداز اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اخوان الصفا کے خطوط میں واضح کیا گیا ہے کہ "علم کی دو قسمیں ہیں: علم اجسام اور علم ادیان"[9]۔ اس میں واضح اشارہ ملتا ہے کہ متقدمین علماء کے نزدیک مطالعہ ادیان کے علم کی بہت اہمیت تھی۔ بہت سے علماء ایسے گزرے ہیں جو اس علم میں اتنے ماہر تو نہ تھے تاہم انہوں نے ایک مخصوص حد تک اس سے متعلق ابحاث کا تذکرہ کیا ہے[10]۔

اس کی ایک مثال پیش کرتے ہوئے محمد ضیاء الرحمان الاعظمی لکھتے ہیں کہ:

> " یحییٰ بن خالد البرمکی نے ایک آدمی کو ہندوستان بھیجا کہ وہ ان کی زمینوں میں پائی جانے والی دواؤں کی جڑی بوٹیاں لائے اور اس کے لیے ان کے مذاہب کے بارے میں لکھے۔ اس طرح یہ کتاب اس کے لیے لکھی گئی[11]۔"

مذاہب کے مطالعہ اور تقابل میں مسلم علماء کا کردار محض وضاحت اور توضیح تک محدود نہیں ہے بلکہ اصولوں کی تشکیل اور ایسے علمی میدان کی اساس رکھنے میں ان کے مطالعاتی منہج کا بنیادی کردار ہے۔ مذاہب کے مطالعہ اور موازنہ کے لیے موزوں طریقہ کار کے اصولوں کو قائم کرنے اور اس علم کی اہمیت کو اجاگر کرنے کا سہرا بھی انہی کے سر ہے۔ ان اصولوں پر محققین کی جانب سے فلسفی ابو الحسن العامریؒ اور ماہر فلکیات ابوریحان البیرونی کے حوالے سے تفصیلی مباحث پیش کی جا چکی ہیں۔[12]

جب مسلمان علماء نے مذاہب کا مطالعہ اور موازنہ کیا تو یہ کسی کمزوری یا مجبوری کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ ان کے عہدِ عروج میں یہ مطالعات سامنے آئے تھے۔ اسلامی ریاست اب بھی کئی براعظموں کی سرزمین پر حکومت کر رہی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے مختلف مذاہب کا مطالعہ کر کے انسانیت کی عظیم خدمت انجام دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ درحقیقت اس میں دوسروں کا محض تعارف نہیں تھا بلکہ انہیں ایک خاص مقام دینا، اور انہیں مذہبی اور فکری حقوق کے ساتھ ایک ہستی کے طور پر اہمیت دینا بھی شامل ہے، جس کو کسی بھی طرح سے

---

[9] محمد حسن المدہون، الملائکۃ والجن، جامعہ ام القریٰ، مکۃ المکرمۃ، ص۱۲۷

[10] بشیر الکردوسی، مدخل إلی علم مقارنۃ الأدیان، مجلۃ الحصاد مرسلۃ بواسطۃ، (۲۰۰۹)، ص۲۰۰۹

[11] محمد ضیاء الرحمٰن الاعظمی، دراسات في الیھودیۃ والمسیحیۃ وادیان الھند، مکتبۃ الرشد الناشرون، الریاض، (۲۰۰۳ء)، ص۲۸

[12] الاعلام بمناقب الاسلام، ص۱۲۵

محمد بن احمد البیرونی، تحقیق ماللہند، مطبعۃ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدر آباد، (۱۹۵۸ء)، ص۴-۵

فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اگر رائے میں کوئی خامی یا عقیدہ میں انحراف ہوتا ہے تو یہ تنقیدی علم کے دائرے میں آتا ہے، جسے مکالمے اور مباحث کے ذریعے بہترین انداز میں، حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ حل کرنے کی روایت موجود رہی ہے۔

اس کے برعکس، اسلامی ریاست کے ہم عصر دیگر نظاموں میں دوسرے مذاہب سے موازنہ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ رومن کلیسائی نظام ان میں سر فہرست ہے جس میں پوپ صاحبان یا پادریوں کے علاوہ کسی کو بائبل پڑھنے کی بھی اجازت نہیں تھی، مقارنۃ الادیان میں داخل ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔ اگر کوئی ایسا کرتا تو اس پر بدعتی ہونے کا الزام لگ جاتا، بلکہ موت کا پروانہ تک جاری کر دیا جاتا۔ معروف جرمن مستشرق آدم میز (Adam Mez) لکھتے ہیں کہ:

> "مسلمانوں نے اپنی زندگیوں میں یہودیوں اور عیسائیوں کے تئیں جس رواداری کا مظاہرہ کیا، وہ رواداری قرون وسطیٰ میں نہیں دیکھی گئی تھی، جس کی وجہ سے مذہبی گفتگو میں "مقارنہ مذاہب کے علم" جیسے ایک ایسے شعبہ کی شمولیت ہوئی جو قرون وسطی میں کبھی موجود نہیں تھی"[۱۳]۔

مسلمان نہ صرف ابراہیمی مذاہب کا مطالعہ کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے، بلکہ انھوں غیر ابراہیمی مذاہب میں بھی دلچسپی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان مذاہب کو انہوں نے اپنے عقائد اور سماجی اور ثقافتی ڈھانچے کے ساتھ دریافت کیا۔ یہاں تک کہ الٰہیات کی کتابوں (علم الکلام) میں بھی ان مذاہب کے مطالعہ اور بحث کی کمی نہیں ہے جو مانیکیت، مزدقیت، ہندومت اور بدھ مت کے ناموں سے دنیا میں مروج رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں[۱۴]۔

مغرب میں تقابل ادیان کے علم کے حقیقی معمار

مغرب نے حال ہی میں مذاہب کے مطالعہ اور تقابل کے حوالے سے جو کچھ بھی دیا ہے، جو انیسویں صدی میں مشہور ہوا، وہ دراصل اسلامی تہذیب کی ابتدائی صدیوں کے دوران اسلامی ماحول کا ہی تیار کردہ ہے۔ لیکن مسلمانوں کی کمزوری اور پسماندگی وجہ سے ان کی جانب سے ادب کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بعد مغربی فکر اس سائنس کی طرف متوجہ ہوئی اور اسے دوبارہ اجاگر کیا[۱۵]۔

---

[13] Adam Mez, Islamic Civilization in the 4th Century AH, (Arabic Translation), National Book Foundation and the Tunisian Publishing House, (1986), VOl 1, P. 342,343

[۱۴] مدخل إلی علم مقارنۃ الأدیان، ص۲۰۰۹۔

[۱۵] محمد حسن احمد خلیفہ، دراسات فی تاریخ وحضارۃ الشعوب السامیۃ القدیمۃ، دار الثقافۃ للنشر والتوزیع، مصر، (۱۹۸۵ء)، ص۱۲۸

اس پر بڑی مغربی یونیورسٹیوں میں بھی روشنی ڈالی گئی، جیسا کہ شکاگو یونیورسٹی میں ۱۸۹۳ میں 'تقابل ادیان' کے نام سے ایک خصوصی شعبہ قائم کیا گیا۔ 'مذہبی علوم' کے لیے ایک الگ شعبہ بھی کھولا گیا۔ اسی طرح، مانچسٹر یونیورسٹی نے ۱۹۰۴ میں ایک شعبہ قائم کیا، اور سوربون یونیورسٹی نے ۱۸۸۵ میں فرانسیسی پارلیمنٹ کے قیام کے فیصلے کے بعد ایک شعبہ کھولا۔ مذہبی علوم کے لیے پہلی چیئر ۱۹۱۰ میں جرمنی کے شہر برلن میں قائم کی گئی تھی۔ مزید برآں، اٹلی میں مذہبی علوم کے لیے پہلی چیئر میلان یونیورسٹی میں قائم کی گئی[۱۶]۔

دوسری جانب مسلمانوں میں مطالعہ مذاہب کی روایت صدیوں پرانی ہے۔

فہم ادیان میں ابوالحسن العامریؒ کا معروضی منہج

ابوالحسن العامریؒ نے مذاہب کے تقابلی مطالعہ میں جس نقطہ نظر کی پیروی کی اس میں اصولوں اور بنیادوں کا ایک مجموعہ شامل ہے جسے انہوں نے اپنے طریقہ کار کے طور پر اختیار کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کو سچائی اور کامیابی کی طرف لے جانے کا بنیادی طریقہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا، اس کی مدد اور رہنمائی حاصل کرنا، اور الزام تراشی کے خوف کے بغیر سچائی کو ظاہر کرنے کے عزم کی تجدید کرنا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ کوئی شخص سچے نتائج پر پہنچنے کے لیے سائنسی اور منطقی اصولوں کو لاگو کرنے کی کتنی ہی کوشش کرے، خدا کی رہنمائی کے بغیر اس کوشش میں کوئی برکت یا مکمل کامیابی نہیں ہوگی۔

لہٰذا العامریؒ نے اس مطالعہ میں بلکہ اپنی پوری زندگی میں، خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور اس کی مدد حاصل کرنے کو اولین ترجیح دی۔ انہوں نے عقلی اور نقلی دلائل کے ذریعے سچائی کو ظاہر کرنے کے اپنے عزم کی تجدید کرتے ہوئے فرمایا کہ:

> "مذہب ایک عظیم ساتھی ہے، یہ اپنی طرف رجوع کرنے والوں کی عزت میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ یہ اپنے آپ سے جڑے ہوئے لوگوں کے لیے دنیا میں سرپوشی کا باعث بنتا ہے اور آخری میں ان کے لیے ابدی خوشی تیار کرتا ہے۔ جس طرح کسی خاص سبب کے بغیر طاقت کسی کو بلند نہیں کر سکتی اسی طرح ایمان کے بغیر محض معلومات کے منتقل ہونے سے کسی کی عقل میں اضافہ نہیں ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ہم اس لائق ہیں کہ عقل دینے والے سے دعا کریں کہ وہ ہمیں نیکی کی راہ دکھائے تاکہ ہم حقانیت کو نورِ حق سے دیکھ سکیں[۱۷]"۔

العامریؒ نے قرآن میں مذکور مندرجہ ذیل ادیان کا تقابلی مطالعہ کیا ہے:

---

[16] Le grand, Atlas des religions, Paris, (1977), P, 30-35.

[۱۷] الاعلام بمناقب الاسلام، ص۱۲۶

- اسلام
- یہودیت
- صابیت
- نصرانیت
- مجوسیت
- دینِ مشرکین

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَٱلَّذِينَ هَادُواْ وَٱلصَّٰبِـُٔونَ وَٱلنَّصَٰرَىٰ وَٱلۡمَجُوسَ وَٱلَّذِينَ أَشۡرَكُوٓاْ [18]

ترجمہ: بے شک وہ لوگ جو مومنین، یہودی، صابی، نصاریٰ، مجوسی اور مشرک ہیں۔

اس آیت میں اسلام، یہودیت، نصرانیت، صابیت، مجوسیت، مشرکین (بتوں کے پجاری) مذکور ہیں۔ ان تمام ادیان میں عقیدہ، عبادت، معاملات، حدود، سزائیں وغیرہ اساسی مشترکات ہیں۔ العامریؒ کہتے ہیں کہ:

"عقل رکھنے والے شخص کے لیے یہ جاننا بعید از قیاس نہیں ہے کہ چھ مذاہب میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو ان میں کسی چیز پر یقین نہ رکھتا ہو۔ ہر ایک مذہب میں بندگی کا ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے اس کے پیروکار اطاعت قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر ایک کے ہاں لین دین کی کچھ شرائط ہیں جن کے ذریعے روزی کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ایسے قوانین و احکام جن سے وہ اپنے آپ کو آفات اور برے لوگوں سے بچاتے ہیں[19]"۔

العامریؒ نے ان ارکان کو ان کی فروعات کے ساتھ درست اور تخلیقی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نے ہر رکن کی فرع کو پانچ زمروں میں اس طرح تقسیم کیا کہ جو ہر مذہب کے عقائد میں عام طور پر موافق محسوس ہوتے ہیں۔ پھر العامریؒ ہر زمرے کو اس رکن کے لیے بنیادی اصول کے طور پر منتخب کیا۔ اس نقطہ نظر کا مقصد یہ سمجھانا ہے:

---

[18] الحج:۱۷

[19] الاعلام بمناقب الاسلام، ص۱۲۱

"کہ مومن اپنے عقیدے کے ہر رکن کا دوسرے مذاہب کے ہم منصب سے موازنہ کر سکے ۲۰"۔

اس کی تقسیم اس طرح ہے کہ:

- **عقائد:** اللہ تعالیٰ پر ایمان، اس کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور آخرت کے دن پر ایمان وغیرہ
- **عبادات:** نفس کی عبادت جیسا کہ نماز، بدنی عبادت جیسا کہ روزہ، مالی عبادت جیسا کہ زکوۃ، ملکی اور قوتی عبادت جیسا کہ جہاد، مشترک عبادت جیسا کہ حج وغیرہ
- **معاملات:** جیسا کہ خرید و فروخت اور اجارہ، نکاح: جیسا کہ شادی اور طلاق وغیرہ، تنازعات: جیسا کہ مختلف مقدمات اور بینات وغیرہ، امانات: جیسا کہ ودیعت اور عاریت وغیرہ، ترکہ: وصیتیں اور وراثت وغیرہ
- **حدود اور سزائیں:** اور وہ اعمال جن کو زواجر سے تعبیر کیا جاتا ہے، کسی نفس کو قتل کرنے کا جرم: جیسا کہ قصاص اور دیت، مال لے لینا: جیسا کہ ہاتھ کاٹنا اور سولی چڑھانا، ستر اور پردہ پوشی کی بے حرمتی کرنا: جیسا کہ کوڑے اور رجم، کسی کی عزت پر حملہ کرنا: جیسا کہ فسق پر کوڑے مارنا، ذمہ کو ختم کر دینا: جیسا کہ ارتداد پر قتل کرنا وغیرہ[۲۱]

ان مباحث میں جن حدود اور سزاؤں کا تذکرہ ہوا ہے، وہ ضروریات خمسہ [۲۲] میں مخل ہونے والوں کو روکنے اور شریعت کے تحفظ کی باعث ہیں۔ اس لیے کہ زندگی کا قیام اور بقا انہی کے ذریعے ممکن ہے۔ مقالہ نگاران کے مطابق العامریؒ وہ پہلے عالم ہیں جنہوں نے ضروریات خمسہ کو بیان کیا ہے تاہم انہوں نے تحفظ عقل کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ عزت کے تحفظ کا ذکر کیا ہے۔ شیخ المقاصد علامہ شاطبی نے بھی عزت کے تحفظ کو ضروریات میں شامل نہیں کیا بلکہ اس کو جان کے تحفظ کے تابع رکھا ہے۔ لہذا العامریؒ کا تحفظ نفس کا ذکر کرنا، تحفظ عقل کو بھی شامل ہے کیونکہ یہ اسی کا ایک جزو ہے [۲۳]۔

العامریؒ کے بیان کردہ تمام ارکان کی فروعات کا مجموعہ بیس تک پہنچتا ہے ۔ پھر اس کے ساتھ کچھ اور چیزیں شامل کی گئی ہیں مثلا بادشاہت (سیاسی اور حکومتی نظام)، رعایا اور عوام (سماجی و معاشرتی نظام)، نسلیں (تہذیب کی کامیابی) اور علم (ثقافتی کارنامے) وغیرہ ان میں

---

[۲۰] ایضاً

[۲۱] ایضاً، ص۱۲۲-۱۲۳

[۲۲] دین، جان، عقل، نسل، مال

[۲۳] الشاطبی، الموافقات، ج۲، ص۲۶۶

شامل ہیں[۲۴]"۔ العامریؒ نے تقابل کے لیے جو اصول پیش کیے ان کی کل تعداد آٹھ ہے۔ انھوں نے معاملات اور زواجر کے سوا ان اصولوں کی توضیح کی اور ان کا موازنہ دوسرے مذاہب کے اصولوں سے کیا ہے۔ ان کی کتاب "الإبانة عن علل الديانة" انہی تفصیلات پر مشتمل ہے[۲۵]"۔

العامریؒ نے مذاہب کے تقابلی مطالعہ میں جن اصولوں اور بنیادوں پر عمل کیا وہ درج ذیل ہیں:

اول: یکساں عناصر کا موازنہ

صرف یکساں عناصر کے درمیان موازنہ کرنا چاہئے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ ایک جانب سے کسی اعلیٰ پہلو کو لیا جائے اور دوسری جانب سے پست ترین پہلو اٹھا کر تقابل کیا جائے۔ اسی طرح ایک جانب سے اصل اور دوسری جانب سے فرع کو لے کر تقابل نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے مطابق مختلف ادیان کے عقائد کا دوسرے ادیان کی عبادات سے تقابل کرنا اور ایک دین کی اصل کا دوسرے دین کی فرع کے ساتھ تقابل کرنا درست منہج نہیں ہے[۲۶]۔

جن چھ مذاہب کا پیچھے تذکرہ کیا گیا ہے ان کے تقابلی مطالعہ میں العامریؒ نے پہلے اساسی پہلوؤں پر توجہ مرکوز کی ہے۔ ان میں عقائد، عبادات وغیرہ شامل ہیں۔ ان کو اپنے مطالعہ کا مرکز بنا کر اصولی چیزوں میں مشترکات کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔

دوم: متعلقہ مذہب کے متفقات پر گفتگو

العامریؒ نے کسی خاص فرقے سے منسوب کسی ایسی خصلت پر توجہ مرکوز نہیں کی جس کو اس مذہب یا فرقے کے تمام پیروکاروں میں وسیع پیمانے پر تسلیم نہ کیا گیا ہو اور پورے گروہ کی جانب اس کی نسبت نہ ہو چکی ہو[۲۷]۔

مثال کے طور پر انہوں نے شیعہ، اباضی یا معتزلی فرقوں کے عقائد کا عیسائیت سے موازنہ کرنے سے گریز کیا ہے حالانکہ یہ فرقے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے حصے کے عقائد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اسی طرح العامریؒ نے ان فرقوں کا دیگر ادیان کے ساتھ تقابل کرنے کی بھی کوشش نہیں کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ہاں اہل سنت والجماعہ کے موقف کا دوسرے ادیان کے ساتھ موازنہ کرنا چاہیے کیونکہ

---

[۲۴] الاعلام بمناقب الاسلام، ص۱۵۱

[۲۵] ایضاً، ص۲۲

[۲۶] ایضاً، ص۱۲۵

[۲۷] ایضاً

دوسرے اسلامی فرقوں کے مقابلے میں یہ اکثریت میں ہیں اور یہی اسلام کے واضح اور صریح نمائندہ ہیں۔

سوم: عقلی توجیہات

العامریؒ نے مذہبی عقائد کو عقل کی میزان پر رکھ کر ان کا احقاق یا بطلان بھی کیا ہے کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ عقل سلیم اور نقل صحیح میں تضاد نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> "ہر شخص پر فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو جھوٹ کی برائیوں سے بچانے کے لیے اپنی تخیلاتی قوت کو عقیدہ اور عقل دونوں پر پیش کرے تاکہ وہ باطل کے نقصانات سے بچ سکے[۲۸]"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ مذاہب کی بنیادوں کا ایسے ثبوتوں کو مد نظر رکھ کر موازنہ کیا جانا چاہیے جن کی صحت پر سب کا اتفاق ہے۔

چہارم: روایاتِ کہن سے اغماض

العامریؒ نے عقائد اور ایمانیات پر سائنسی و علمی نقد کے تناظر میں اندھی تقلید پر سخت تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمیں قرآنی اسلوب کی جانب رجوع کرنا چاہیے۔ یہ وہ طرز عمل ہے جس میں ایک مسلمان دوسروں کو کسی کام کا حکم دینے سے پہلے خود اپنی اصلاح کرتے ہوئے عدل و انصاف کی مثال قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے[۲۹]۔

العامریؒ نے مذہبی فرد کو یہ دعوت دی ہے کہ:

> "روایت سے محبت کی وجہ سے واضح استدلال کی مخالفت نہ کریں۔ خاص طور پر جب اس کا تعلق کسی ایسے شخص کے ساتھ نہ ہو جو بے قصور ہے۔ سچائی کو انسان سے نہیں، بلکہ اپنے جوہر سے پہچانا جاتا ہے[۳۰]"۔

العامریؒ کے مطابق مذاہب کا تقابلی مطالعہ استقرائی، توضیحاتی، تجزیاتی اور معروضی منہج پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ مذاہب کے مابین مشترکہ بنیادوں سے متعلق شواہد جمع کرتے ہیں، ان کی وضاحت کرتے ہیں، تقابل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ مذاہب کے مابین ان بنیادوں کا کس قسم کا تعلق ہے، اور پھر عقلی اور نقلی دلائل کی بنیاد پر ان کا معروضی تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کے ہاں زیادہ تر جن اساسی چیزوں کا حوالہ دیا گیا ہے، ان کا

---

[۲۸] الاعلام بمناقب الاسلام، ص۷۹

[۲۹] ایضاً، ص۱۲۱-۱۲۲، ص۹۸، ۸۶، ۸۳-۹۹۔

[۳۰] ایضاً، ص۱۱۸-۱۱۹۔

اصل ماخذ اسلامی قانون ہے۔

اگر "تقابل ادیان" کی اصطلاح سے مراد، جیسا کہ مغربی اسکالرز استعمال کرتے ہیں، مذاہب کے فلسفے، ان کی تاریخ، سماجیات اور مذہب کی نفسیات کا جائزہ لینا ہے تو مذاہب کی بنیادیں سمجھنے کے لیے معروضی طریقہ کار کا استعمال کرتے ہوئے ایسے مضامین ہونے چاہئیں جن کے اپنے اصول اور اپنی خصوصیات ہوں۔ العامریؒ اس معیار پر پورا اترتے ہیں کیونکہ انھوں نے مذاہب کے مابین تقابل کے لیے ایسی علمی بنیادوں کا سہارا لیا جو نہ صرف ان مذاہب کے مابین مشترک ہیں، بلکہ فلسفہِ مذاہب کے ستونوں میں سے ایک ہے۔ دوسری صدی ہجری سے شروع ہو کر اب تک ادیان کے تقابل اور مطالعہ میں اسلامی اسکالرز کی یہی روش رہی ہے۔

مغربی دنیا میں تقابل ادیان کی سائنس نے ماضی قریب میں اپنا ارتقاء شروع کیا اور اب اپنا وجود قائم کیا ہے۔ تقابلِ ادیان کے شعبہ میں کام کرنے والے فلسفہ نے "فینومینولوجیکل اسٹڈیز" کا نام استعمال کیا ہے۔ یہ طریقہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ مذاہب کی بنیادوں کے مظاہر کو تقابل اور مطالعہ کے دوران کسی بھی قسم کا پیشگی فکری ڈھانچہ مسلط کیے بغیر اپنے بارے میں بات کرنے کی اجازت دی جائے[۳۱]۔ پہلا وہ شخص جس نے مغرب میں سے اس طریقہ کو متعارف کرایا ہے، وہ (Edmund Husserl) ہے، اخلاقیات کے مطالعہ میں (Maxsheller) کا نام آتا ہے[۳۲]۔

اسی نقطہ نظر کو اسلامی اسکالرز نے مذاہب کے مطالعہ اور تقابل میں اپنایا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ "مظاہریاتی طریقہ کار" کی بنیادی باتیں مسلم اسکالر ابوریحان البیرونی (متوفی ۴۴۰ھ) کو اچھی طرح معلوم تھیں۔ البیرونی نے ہندوستانی مذہب اور ثقافت پر اپنے قابل ذکر کام میں ان اصولوں کا بالکل درست اطلاق کیا ہے[۳۳]۔

اسی طرح جب ہم مذہبی مظاہر کے غیر معمولی مطالعہ پر غور کرتے ہیں تو ابو الحسن العامریؒ یہ واضح کرتے ہیں کہ غلطی اور خلاف واقعہ امور سے بچنے کا خیال رکھتے ہوئے مظاہر کا مطالعہ ایسا ہو جیسے وہ ہیں۔ یہ حالت دراصل غیر جانبداری اور معروضیت کے عزم کا نام ہے۔ یہ تعریف العامریؒ کے ہاں متنوع مذہبی مظاہر کے مطالعہ کے طریقہ کار کی بنیاد کی نمائندگی کرتی ہے۔

العامریؒ نے اس سلسلے میں البیرونی سے پہلے مذاہب کی ان بنیادوں اور اصولوں کی وضاحت کی جو ان کے اندر موجود جوہر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ ان بنیادوں کے ذریعے مذاہب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس طرح ہر مذہب کو ایک ایسی تصویر فراہم کی جاتی ہے جو اس کی

---

[۳۱] اسماعیل راجی الفاروقی، أطلس الحضارۃ الاسلامیۃ، مکتبۃ العبیکان، الریاض، (۱۴۱۸ھ)، ص۲۵۔

[۳۲] ایضاً۔

[۳۳] ایضاً، ص۲۵۔

واقعیت کو ثابت کرتی ہے۔ تاہم وہ ان آٹھ اصولوں کی اپنی پیشکش کے ذریعے تنقیدی تجزیے سے کام لے کر آگے بڑھ گئے جن کا پیچھے ذکر کیا گیا ہے۔ پس کسی نتیجے اور مقصد تک پہنچنے کے لیے سائنسی مطالعہ میں تنقید اور تجزیہ شامل ہونا چاہیے، لیکن ثبوت پیش کرنے میں معروضیت اور غیر جانبداری دکھائی جائے اور عقلی دلائل کے علاوہ کسی اور شے کو ترجیح دینے کا معیار نہ بنایا جائے۔ یہی کام العامریؒ نے مذاہب کے تقابلی مطالعہ میں، شک کو ختم کرنے کے لیے فیصلہ کن عقلی اور نقلی دلائل کا استعمال کرتے ہوئے کیا۔

مطالعہ مذاہب میں احمد شلبیؒ کا معروضی منہج

استاذ شلبیؒ کتاب کی ابتداء میں ہی یہ واضح کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے رحمت کی امید اور قرآن مجید کا علم، یہ دو چیزیں ان کے پاس ہیں اور وہ پر یقین ہیں کہ یہی چیزیں لوگوں کی رہنمائی کرنے، ان کے دلوں میں بشارتوں کو راسخ کرنے اور ان کو گناہوں سے محفوظ رکھنے میں ممد و معاون ہوتی ہیں[۳۴]۔

یہی طریقہ ابو الحسن العامریؒ نے بھی اختیار کیا ہے۔

استاذ شلبی ادیان کے مطالعہ اور تقابل کے لیے استقرائی، توصیفی، تحلیلی اور علمی نقد کا منہج قائم کرتے ہیں۔ اس منہج میں ہر فریق کے دلائل کا استقراء اور تتبع کیا جاتا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے مقصد کے حصول کے لیے دلائل کا تتبع کر رہا تھا تاکہ مذاہب کے درمیان مشترک بنیادوں کا موازنہ کیا جا سکے۔ ان کے مشترکات کے دلائل کو پیش کیا جا سکے اور ان مذاہب کا معروضی اور تنقیدی انداز میں اس طرح تجزیہ کیا جائے کہ اس تجزیہ میں موجود وضاحتوں کی مدد سے خود ہدف تک پہنچنا آسان ہو جائے[۳۵]۔

بالفاظ دیگر، شلبیؒ نے دلائل و شواہد کا جائزہ لیا تاکہ ہر مقام پر نتیجہ خود ظاہر ہو جائے اور اس میں ذاتی یا موضوعی فیصلے کو مسلط نہ کیا جا سکے۔ ان کا خیال ہے کہ ذاتی میلانات اور رجحانات حقیقی تصور سے انسان کو دور لے جاتے ہیں اور ان سے گریز کرنے کے لیے ہی دلائل کا استقراء کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ عصرِ جدید میں اس منہج کو فینو مینولوجیکل وضاحتی منہج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مذاہب کے تقابلی مطالعہ میں الشیخ احمد شلبیؒ نے جو طریقے اختیار کیے ان کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

علمی تنقید کا منہج

الشیخ احمد شلبیؒ نے اپنی کتاب میں اس سوال کا جواب پیش کیا ہے کہ مروجہ عیسائیت نے اپنے عقائد اور مذہبی رسوم کہاں سے اخذ کی

---

[۳۴] شلبیؒ، احمد، مقارنۃ الادیان، الیھودیۃ، مکتبۃ النھضۃ المصریۃ، القاہرۃ (۱۹۸۸ء)، ص ۲۶

[۳۵] ایضاً، ص ۳۶

ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عیسائیت کے متعدد عقائد اور مذہبی رسوم بدھ مت سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً تثلیث کا مفروضہ، مصلوبیت کے ذریعے انسانیت کے گناہوں کا کفارہ، آسمانی اور جنت کی بادشاہی میں دخول کے لیے ترکِ دنیا اور رہبانیت کو اپنانا وغیرہ بدھ مت کے ہی اثرات کا نتیجہ ہیں۔ یہ مذہب دنیا میں عیسائیت سے متعدد صدیاں قبل موجود اور مروج تھا اس لیے بدھ مت کے جہاں دیگر مذاہب پر اثرات مرتب ہوئے، وہاں عیسائیت بھی اس سے بڑے پیمانے پر متاثر ہوئی تھی[۳۶]۔

یہ ان کا تجزیاتی اور تنقیدی نقطہ نظر ہے، لیکن وہ اس تنقیدی فکر کو اس کے اصل ماخذ سے اخذ کردہ دلائل سے واضح کرنے سے پہلے کوئی تبصرہ اور تنقید نہیں کرتے۔ احمد شلبیؒ کسی بھی مقدمے کو قائم کرنے سے قبل اس مقدمہ سے قبل متعلقہ مذہب کے مستند علماء کی آراء نقل کر کے اس کی علمی بنیاد قائم کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اس مقدمے پر علمی تنقیدات پیش کرتے ہیں تاکہ متعلقہ مذہب کے لوگوں کی نظر میں اس کو قبول کرنے کے امکانات میں اضافہ ہو سکے۔ وہ یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس مذہب سے متعلق بحث ہو رہی ہے اس مذہب کے پیروکار اس کو کس انداز میں سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی کتاب میں متعدد مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً:

- "نماذج من التشريع المسيحي" میں انھوں نے عیسائیوں کی عبادات، خاندان سے متعلق قانون سازی، افزائش نسل کا اہتمام، اور قانون سازی کا فقدان پیش کیا ہے۔
- "الكنيسة وطقوسها وأسرارها" میں احمد شلبیؒ نے چرچ کی رسومات اور کلیسائی رسمیں بیان کی ہیں۔
- "الرهبنة والأديرة" میں رہبانیت کے مراحل اور رہبانیت کی بنیادیں بیان کرنے کے بعد یہ واضح کیا ہے کہ مسیحیت میں مروجہ رہبانیت ہندوستانی فکر سے لی گئی ہے[۳۷]۔

یہ تفصیلات احمد شلبیؒ کے تنقیدی جائزے سے قبل متعلقہ موضوعات کے ضمن میں راہ ہموار کرتی ہیں جن کی بنا پر وہ قاری پر واضح کرتے ہیں کہ عیسائیت کے بارے میں مسلم مؤقف تعصب کی بنا پر نہیں بلکہ خالصتاً علمی اساس پر قائم ہوا ہے۔

یہاں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مذاہب کے تقابل میں معروضیت اس بات میں مضمر ہے کہ دلائل کو علمی صداقت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ محض کسی خاص جز یا تاویل کو سامنے رکھ کر کیا جانے والا تجزیہ حقائق کو مسخ کر کے رکھ دے گا۔ اگر دلائل سے مروجہ سوچ کے برخلاف کسی نتیجے پر پہنچا جاتا ہے تو اسے معروضیت سے الگ نہیں سمجھا جاتا۔ اگر ہمارے ہاں سچائی اور صداقت کا معیار غالب لوگوں کی رائے اور اکثریت ہو تو

---

[۳۶] ایضاً، ص۱۷۸

[۳۷] مقارنۃ الادیان، الیھودیۃ، ص۲۳۵-۲۳۷

مذاہب اور دیگر علوم کا مطالعہ اور تقابل اپنی قدر و اہمیت کھو دے گا، کیونکہ سچائی کو اکثریت یا تعداد سے نہیں جانا جاتا بلکہ اس کو دلائل کی بنیاد پر تسلیم کیا جاتا ہے خواہ اس کا پیروکار ایک ہو یا ایک جماعت ہو۔

مظاہراتی اوصاف پر مبنی تحلیلی اور تنقیدی منہج

پیچھے بیان ہو چکا ہے کہ مختلف مذاہب کے مابین تقابل کے لیے تنقیدی جائزہ مظاہراتی اوصاف پر مبنی ہوتا ہے تاکہ تقابلی فکر کے ذریعے انسان اپنے مطلوب اور مقصد تک رسائی حاصل کر لے۔ یہی احمد شلبیؒ کے مسیحی عقائد کے حقیقی ماخذ پر تحقیق کے منصوبے سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً فہرست میں مندرجہ ذیل سرخیاں اس ضمن میں لائق التفات ہیں:

- مسیحیت سے متعلق مصری فکر
- مسیحیت میں بت پرستی
- بت پرستی پر مبنی عقائد کا حالیہ مسیحیت کے عقائد سے تقابل
- بعل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مابین محاکمہ کا تقابل
- بدھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے مابین تقابل
- مغربی سیاست کے لیے کلیسا کی خدمات[۳۸]
- اناجیل کا تعارف
- متی کی انجیل
- مرقس کی انجیل اور مسیح کی الوہیت کا انکار
- مرقس کی لاش قاہرہ اور وینس کے درمیان
- لوقا کی انجیل
- یوحنا کی انجیل اور اسے کس نے لکھا؟
- برنباس اور اس کے مصنف سے متعلق بحث

[۳۸] ایضاً، ص۱۷۷-۱۸۸

- مسیح اپنی الوہیت کا انکار کرتے اور اپنی انسانیت کی تصدیق کرتے ہیں۔[۳۹]

مذکورہ بالا موضوعاتی تقسیم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عنوانات جہاں ایک طرف مسیحیت کے عقائد، اس کی کتب اور مغربی ممالک کے استعماری اقدامات کے لیے کلیسا کے اقدامات کو ظاہر کرتے ہیں وہاں ریاست اور چرچ کے گٹھ جوڑ سے متعلق بھی اہم انکشافات کرتے ہیں۔ احمد شلبیؒ کی تحریروں میں مختلف اناجیل کا تعارف کرانے کے ساتھ الوہیت مسیح کے تصور پر نقد کیا گیا ہے۔ بایں صورت یہ کہ مرقس کی انجیل میں خود مسیحؑ نے اپنی الوہیت کا انکار کیا ہے۔ یہ تمام امور دراصل مصنف کی جانب سے مظاہراتی اوصاف پر مبنی ایک تنقیدی اور تحلیلی منہج کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

تاریخی نقد کا منہج

بعض اوقات بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے کہ پروفیسر احمد شلبیؒ کی رائے متعلقہ مذہب کے مفکرین کی آراء سے مختلف ہے لیکن وہ تعصب کے الزامات سے بچنے کے لیے زیر بحث مقدمہ کے ضمن میں متعلقہ مذہب کے حامیوں کے بیانات اور شواہد پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ان کا ایک دعویٰ ہے کہ مغربی نوابادیات میں مغربی استعمار کو مضبوط کرنے میں کلیسا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس موقف کو ثابت کرنے کے لیے وہ سیاست اور مذہب کے عیسائی ماہرین کی رائے کا باقاعدہ حوالہ دیتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ:

> "محقق حیران رہ جاتا ہے جب وہ چرچ کے ممتاز رہنماؤں کو دیکھتا ہے کہ وہ عیسائیت اور اس کے حقیقی ہمدردانہ اصولوں کو نظر انداز کر کے خود کو استعمار کی خدمت میں مشغول رکھتے ہیں۔ وہ عیسائی عقیدے کو ترقی پذیر عیسائی قوموں پر دباؤ ڈالنے کے لیے ایک آلے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، انھیں آگے بڑھنے سے روکتے ہیں اور انھیں صنعت کاری اور ترقی سے دور رکھتے ہیں[۴۰]"۔

شلبیؒ مزید کہتے ہیں کہ:

> "یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ یہ ایک پڑھے لکھے عیسائی ڈاکٹر رمزی فہیم کے الفاظ ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں کئی سالوں سے ورلڈ چرچ کونسل (WCC) کے اجلاسوں اور فیصلوں کے بارے میں پڑھ رہا ہوں اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ان کے سامنے آنے والے مسائل ان مذہبی موضوعات میں شامل نہیں ہیں جن پر توجہ دینے کی توقع کی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر، کونسل نے یونان کے شہر تھیسالونیکی میں

---

[۳۹] ایضاً، ص۲۱۱-۲۲۷

[۴۰] ایضاً، ص۱۸۹

> ۱۹۵۹ء میں ایک کانفرنس منعقد کی، جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ سیاست ہی وہ میدان ہے جس میں افریقی، ایشیائی اور لاطینی امریکی ممالک میں کلیسا کو کام کرنا چاہیے۔ عجیب بات یہ ہے کہ کونسل نے اسی کانفرنس میں فیصلہ کیا کہ مغربی اصول جو کہ مذہب کو ریاست سے الگ کرنے کا تقاضا کرتا ہے، ترقی پذیر ممالک میں اپنایا نہیں جا سکتا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عیسائیت کی دو قسمیں ہیں؟ جن میں سے ایک مغربی ممالک میں لاگو ہوتی ہے اور دوسری ترقی پذیر ممالک میں، جسے لاگو کرنے کے لیے "ماہرین" کی طرف سے "من گھڑت" تعبیرات کی ضرورت ہوتی ہے[۴۱]۔

اس موضوع کو بیان کرنے کے لیے شبلیؒ نے بیسویں صدی کے بے شمار تاریخی حوالہ جات نقل کیے ہیں۔ یہ حقائق کو قائم کرنے کے لیے ایک اہم تاریخی طریقہ کار ہے جس پر پروفیسر شبلیؒ نے اپنی علمی تحقیق کی بنیاد رکھی۔

مغربی اسکالرز اس طریقہ کار کو مذاہب کے مطالعہ اور موازنہ کے لیے بنیادی ستونوں میں سے ایک سمجھتے ہیں۔ ان کے ہاں تقابلِ مذہب کی اصطلاح کا مفہوم ہے کہ مذاہب کے فلسفے کی وضاحت کے لیے ان کی تاریخ اور ان کے ماخذ کو سائنسی مطالعہ کے لیے مضامین کے طور پر معروضی طریقوں سے سمجھنا، جن کی اپنی بنیادیں اور خصوصیات ہیں۔

استقرائی منہج

اگر احمد شبلیؒ کے تحقیقی منصوبے کا جائزہ لیا جائے تو درج ذیل مخصوص مثالوں سے واضح طور پر استقرائی طریقہ کار واضح طور پر موجود ملتا ہے:

- علاقہ اور اس کے باشندے
- آس پاس کے علاقے
- عبرانیوں کی نقل و حرکت
- عبرانیوں کی زبان
- مصر میں ہیکسوس اور عبرانی اور اس سے ان کا انخلاء
- مصر میں، اسرائیل اور اس کے بیٹے

---

[۴۱] ایضاً

- مصر سے نکلنے کے بعد[۴۲]

پروفیشر شلبیؒ نے جن استقرائی دلائل کا ذکر کیا ہے ان میں تین اہم نقشے، تورات (پیدائش، گنتی اور خروج) اور قرآن مجید (الشعراء، التوبۃ، الحجرات، آل عمران، القصص، الاعراف) کے علاوہ متعدد محققین (کارلوس فوسٹر، گستاوف لیبان، ول ڈیورانٹ، سلیمان مظہر وغیرہ) شامل ہیں۔

مصادر و مراجع کا اہتمام

پروفیسر احمد شلبیؒ کے نزدیک علمی مناہج میں سے ایک یہ ہے کہ ان مصادر و مراجع کو پیش کیا جائے جن سے مطالعہ کے دوران استفادہ کیا گیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

> "ایک فخر جو میں محسوس کرتا ہوں اور جس کے لیے میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں نے تقابلی مذاہب کے مطالعہ میں حوالہ جات کے حوالے سے حقیقی فکر پر عمل کیا ہے۔ پس میں نے بنیادی طور پر مختلف مذاہب کے عقائد کے مطالعہ کے لیے اہم حوالوں پر انحصار کیا، انہی کے مراجع سے ان کے نظریات پیش کیے، اور ان تمام کتابوں میں میرا یہی اسلوب تھا۔"[۴۳]

معروضی اور غیر جانبدارانہ نقطہ نظر

احمد شلبیؒ مذاہب کے تقابلی مطالعہ میں غیر جانبداری اور معروضیت کے طریقہ کار پر کاربند نظر آتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے مذہبی علوم کے میدان میں ایک مضبوط اور متحرک کام کرنے کے لیے خود کو اس سے وابستہ کیا۔ موصوف کا یہ اسلوب و منہج سائنسی تحقیق کے طریقہ کار سے مطابقت رکھتا ہے، جو کہ "منظم سائنسی طریقوں پر عمل کرتے ہوئے معلومات کی تلاش اور علم حاصل کرنے" کے تسلسل پر زور دیتا ہے[۴۴]"۔

وہ کہتے ہیں کہ:

---

[۴۲] ایضاً، ص۳۷-۶۷

[۴۳] ایضاً، ص۳۵

[۴۴] ومیرفت علی خفاجۃ، فاطمۃ عوض صابر، أسس ومبادی البحث العلمی، مطبعۃ الاشعاع الفنیۃ، الاسکندریۃ، (۲۰۰۲ء)، ص۲۵

"میں مذاہب کے تقابل میں آگے بڑھا... میں نے صبر کو اپنا راستہ اور ذریعہ بنایا، اور ایک سائنسی تحقیق کا آغاز کیا جس میں جذبات کا دخل نہیں تھا[۴۵]"۔

ایک اور جگہ ذکر کرتے ہیں کہ:

"میں چلتا رہا... غیر جانبداری میرا راستہ تھا، جس سے میں نے انحراف نہیں کیا اور نہ ہی اس سے بھٹکا۔ میں نے اپنے آپ کو یا اپنے خیالات کو ان پر مسلط کیے بغیر، مقصد تک لے جانے کے لیے نصوص کی پیروی کرتے ہوئے اپنے ذرائع کو آسان بنایا۔ میرا مقصد مطالعہ کو موضوعی نہیں بلکہ مقصدی بنانا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ صحیح راستہ ہے... میں نے منصفانہ اور با مقصد رہنے کی پوری کوشش کی ہے اور مجھے امید ہے کہ میں نے جو حاصل کرنا تھا اس مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں[۴۶]"۔

شبلیؒ کچھ ایسے مفکرین کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں جو اپنی تحقیق میں تقابلی مذاہب کی سائنس میں غور وخوض کا ارادہ کیے بغیر اس میدان کا استعمال کرتے ہیں اور پھر وہ ایسے نتائج کے ساتھ مذاہب کے درمیان تفریق کا دعویٰ کرتے ہیں جو سائنسی بنیادوں پر مبنی نہیں ہیں[۴۷]۔ وہ بتاتے ہیں کہ تقابلی مذہب کا فلسفہ:

"ایک شاندار فکری دولت پیدا کرتا ہے جو اسلام کی خوبصورتی اور دوسروں پر اس کی برتری کو اجاگر کرتا ہے۔ تقابلی مذہب پر مبنی مطالعہ، مذہبی مسائل کو حل کرتا ہے، ان کی وضاحت کرتا ہے، ان کے عناصر کو نمایاں کرتا ہے اور ان کا موازنہ کرتا ہے[۴۸]"۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

"جیسا کہ ہم نے الوہیت کے مسئلے میں کیا، جہاں ہم نے خدا تعالیٰ کے بارے میں مختلف مذہبی نقطہ نظر کو پیش کیا۔ ان نظریات نے واضح کیا کہ اسلامی فکر ایک بلند پایہ فکر ہے، جب کہ دیگر نظریات، انحراف،

---

[۴۵] ایضاً، ص۱۷

[۴۶] ایضاً، ص۳۶

[۴۷] ایضاً، ص۳۶

[۴۸] ایضاً

بت پرستی اور شرک سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ امر اس وقت بھی واضح ہوا جب ہم نے انبیاء کے معجزات، مقدس صحیفوں اور قانون سازی کا جائزہ لیا[۴۹]"۔

دونوں حضرات کے مناہج میں موافقات

اول: دونوں نے مذاہب کا مطالعہ کرنے کے لیے استقرائی منہج اختیار کیا، جس میں کسی خاص فکر سے متعلق کسی جامع نتیجے پر پہنچنے کے لیے جزوی دلائل کا سہارا لیا جاتا ہے۔

دوم: ان دونوں نے اس رجحان کے لیے اپنے مطالعہ کی بنیاد بیانیہ منہج پر قائم کی ہے تاہم تنقید اور تجزیہ کے حوالے سے ان دونوں طریقوں میں فرق ہے۔ (جس کی وضاحت بعد میں کی جائے گی۔) عام طور پر، انہوں نے توضیحی مظاہراتی طریقہ (فیومینولوجی) کی پیروی کرتے ہوئے نتائج ثبوت پیش کیے ہیں۔ جن میں سائنسی تحقیق کے اصولوں کے مطابق کوئی کمی یا اضافہ شامل نہیں ہے، اس سے وہی نتائج سامنے آتے ہیں جس کے لیے اس مطالعہ کو مختص کیا گیا تھا۔

سوم: اسی طرح انہوں نے تقابل ادیان کے لیے کیے گے مطالعہ میں تاریخی نقد کا بھی استعمال کیا ہے۔ ابو الحسن العامریؒ نے چھ ادیان یعنی اسلام، یہودیت، نصرانیت، صابیت، مجوسیت اور مشرکین کا ذکر کیا ہے۔ یہ تمام مذاہب اپنی ابتداء اور ارتقاء کے لحاظ سے نیشاپور و خراسان میں موجود تھے، جو ان کے ماحول میں جڑے ہوئے تاریخی نقطہ نظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ تاریخی منہج دو اہم ستونوں پر انحصار کرتا ہے:

- توضیحی اور بیانیہ منہج
- معیاری منہج

پہلے مرحلے میں محقق اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ تجزیاتی رجحان کو درست طریقے سے بیان کیا جائے۔ اس کے ساتھ اسے سمجھنے کے عمل اور نتائج تک رسائی کو یقینی بنایا جاتا ہے۔

دوسرے مرحلے میں عقلی اور علمی فیصلے کیے جاتے ہیں۔ اس طرح اس رجحان کے بارے میں سائنسی و منطقی علم حاصل ہوتا ہے[۵۰]۔

العامریؒ نے دونوں طریقوں پر عمل کیا۔ اسی طرح (پیچھے بیان کیا جا چکا ہے کہ) احمد شلبیؒ نے یہودیت اور عیسائیت کے اپنے مطالعہ میں تاریخی طریقہ استعمال کیا ہے۔

---

[۴۹] ایضاً

[۵۰] حشادی، المنہج التاریخی، (۲۰۰۹ء)

چہارم: دونوں نے تقابل ادیان کے مطالعہ میں تجزیاتی اور تنقیدی منہج کا استعمال کیا ہے۔ تاہم ان کے تجزیے اور تنقید کے نقطہ نظر کے درمیان فرق اس وقت واضح ہو جائے گا جب ان کے مظاہراتی وضاحت کے نقطہ نظر کے بارے میں بات کی جائے گی۔

پنجم: دونوں نے مقاصدی منہج کا تذکرہ کیا ہے جس میں تقابلی مطالعہ کی غرض ہوتی ہے۔ ابو الحسن العامریؒ کے نزدیک تقابلی مطالعہ کا مقصد، اسلام کی دیگر تمام ادیان پر فضیلت کو بیان کرنا ہے۔ ان کی کتاب کا عنوان (الاعلام بمناقب الاسلام) بھی اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔ احمد شلبیؒ کے نزدیک بھی یہی مقصد ہے تاہم انہوں نے اس کو صراحتاً ذکر نہیں کیا بلکہ اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ:

> "تقابلی مطالعہ ایک حیرت انگیز علمی دولت پیدا کرتا ہے جس سے اسلام کی خوبصورتی اور ہر چیز پر اس کی برتری نمایاں ہوتی ہے ۵۱"۔

تاہم ان کے تقابلی مطالعہ میں توضیح اور غیر معمولی مظاہراتی پہلو العامریؒ سے زیادہ منظم ہیں۔

ششم: ان دونوں نے مطالعہ اور موازنہ کے لیے غالب اور مروجہ فکر کو پیش کرنے کے لیے معروضی انداز اپنایا ہے۔ یہ العامریؒ کے کام میں واضح ہے، بایں صورت کہ انہوں نے مناسب موازنہ کا اصول قائم کیا اور یہ واضح کیا کہ یہ مذہب کی مروجہ فکر کے درمیان ہونا چاہیے۔ اسی لیے ان کی تحریر میں مرکزی دھارے میں اکثریت پر مبنی سنی اسلامی فکر کا غالب عیسائی سوچ سے موازنہ کیا گیا ہے۔ یہی طریقہ شلبیؒ نے بھی اپنایا ہے۔

ہفتم: پہلے بیان ہو چکا ہے کہ العامریؒ نے یہ واضح کیا ہے کہ جو کوئی تقابلی مطالعہ کرنا چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ نوع اور درجات کو سامنے رکھ کر تقابل کرے، فرض کا فرض اور اصل کا اصل کے موازنہ کیا جائے۔ یعنی عقائد کا عقائد سے موازنہ اور اسی طرح دیگر چیزوں کا موازنہ کرے۔ انھوں نے اس بات کی کوئی توجیہ نہیں بتائی کہ آیا مذاہب کی بنیادوں کا موازنہ ایک کتاب میں ہونا چاہیے جس میں ایک ہی تقابلی مطالعہ میں مختلف مذاہب کے تمام بنیادی اصولوں کا احاطہ کیا جائے، یا ہر مذہب کے اصولوں کا الگ الگ تجزیہ کیا جائے۔ تاہم ان کا تقابلی کام پہلے نقطہ نظر پر مبنی تھا۔

محقق شلبیؒ نے بڑے اہم مسائل کا ایک دوسرے کے ساتھ موازنہ کرنے میں اسی انداز پر عمل کیا، لیکن انہوں نے ہر مذہب کے لیے ایک کتاب وقف کرنے کے طریقہ کار کو ترجیح دی ہے جس میں اس کے عقائد اور مختلف قانون سازی کا مطالعہ کیا جاتا ہے، تاکہ ضرورت کے وقت اسی طرح موازنہ کرنا ممکن ہو ۵۲۔

---

۵۱ مقارنۃ الادیان، الیھودیۃ، ص ۳۱

۵۲ ایضاً، ص ۳۴

انہوں نے وضاحت کی کہ مذاہب کی بنیادوں کا مطالعہ کرنے اور ان کا ایک ہی کتاب میں موازنہ کرنے کا طریقہ الشیخ العقادؒ نے اپنی کتاب (اللہ) میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح (Max Mueller) نے بھی یہی منہج اختیار کیا ہے۔[۵۳]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شلبیؒ کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ العامریؒ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مذاہب کے تقابلی مطالعہ میں اس طریقہ کو ایک منظم انداز کے طور پر بیان کیا اور اسے اپنایا۔

مقالہ نگاران کا خیال ہے کہ مذاہب کے درمیان مشترک اصولوں اور بنیادوں کو ایک کتاب میں رکھنے اور اس میں تقابلی مطالعہ کرنے کے حوالے سے العامریؒ کا طریقہ کار زیادہ کارآمد ہے۔ اس نقطہ نظر میں خیالات کی وضاحت اور نتائج کو آسانی سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے کیونکہ اس طریقہ سے قاری موازنہ اور مطالعہ کے بہاؤ کو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔ اس کے برعکس، ان اصولوں کو ایک سے زیادہ کتابوں میں بکھیرنا، ہر مذہب کے اصولوں کا الگ الگ مطالعہ اور موازنہ کرنے سے الجھن پیدا ہو سکتی ہے۔ مزید یہ کہ مذاہب کے درمیان بہت سے مشترک پہلو مختلف جلدوں میں منتشر ہونے کے بجائے، جب ایک کتاب میں ہوں گے تو موازنہ کرنا زیادہ آسان ہو گا۔

دونوں حضرات کے مناہج کے متفرقات:

اول: دونوں محققین نے مذاہب کے مطالعہ میں ایک مؤثر وضاحتی نقطہ نظر اپنایا لیکن ان کے تجزیاتی اور تنقیدی طریقہ کار مختلف ہیں۔

العامریؒ نے مظاہراتی نقطہ نظر کی لفظی پیروی نہیں کی اور نہ ہی انہوں نے اپنے طور پر شواہد سے نتائج کو صیقل ہونے دیا بلکہ نقلی اور عقلی دلائل پر مبنی معروضی انداز میں تنقید اور تجزیہ کا بیان شامل کیا ہے۔

جہاں تک شلبیؒ کا تعلق ہے تو انہوں نے اپنے آپ سے جس چیز کا عہد کیا تھا اس کا پابند رہنے کا التزام کیا ہے۔ انہوں نے مذاہب کے مطالعہ میں نصوص کی بنیاد پر اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے لیے وہی تجزیہ اور تنقید اختیار کرنے پر زور دیا جن کے ذریعے دلائل تک رسائی ممکن ہو سکتی ہے۔ لہذا وہ اس حد تک تو متفق ہیں کہ مقصود تک رسائی کے لیے علمی مقدمات کی پیش کش ہو، تاہم اس تنقیدی تجزیہ میں مختلف ہیں جو انہیں نتیجہ کی طرف لے جاتا ہے۔

دوم: اپنے مطالعہ اور مذاہب کے تقابل میں العامریؒ نے زیادہ تر عقلی اور ثبوتی نقطہ نظر کو اپنایا ہے۔ ان کی کتاب اس اعتبار سے ممتاز ہے کیونکہ انہوں نے ہر باب کا آغاز یوں کیا ہے کہ جس میں استدلال اور عقل کی روشنی کو استعمال کر کے مقصود اور نتیجہ تک پہنچنے کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ خصوصیت ان کے فلسفی ہونے سے مطابقت رکھتی ہے کیونکہ ان کا شمار اسلام کے عظیم فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ وہ ابن سینا

---

[۵۳] ایضاً

کے شیخ، اور الکندی کے شاگرد ہیں۔ اس طرح کے کبار علماء سے انہوں نے فلسفہ کا علم حاصل کیا۔ لہذا ان کی کتاب کو مطالعہ مذاہب کے لیے اہم شمار کیا جاتا ہے جس میں دلائل عقلیہ اور فلسفہ کے ذریعے تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے دلائل نقلیہ بھی پیش کیے گئے ہیں۔

جہاں تک احمد شلبیؒ کا تعلق ہے تو العامریؒ کے نقطہ نظر کے برعکس ان کے نقطہ نظر میں منقول استدلال کا پہلو اپنی علمی سائنسی حیثیت کے لحاظ سے عقلی استدلال پر غالب رہا ہے کیونکہ وہ ایسے محقق ہیں جن کا فلسفہ سے کوئی خاص واسطہ اور تعلق نہیں رہا ہے۔

سوم: مذاہب کے مطالعہ کے حوالے سے العامریؒ کا انسائیکلوپیڈیا ایک ممتاز مقام کا حامل ہے۔ انہوں نے مذاہب کے تقابلی مطالعہ میں مختلف علوم کا استعمال کیا ہے۔ جو کوئی بھی ان کی کتاب (الاعلام) کو غور سے دیکھے گا وہ ان تمام معاملات کا نہ صرف مطالعہ کر سکے گا بلکہ یہ بھی جان سکے گا کہ مذاہب کے مطالعہ کے دوران انہوں نے جس طرح کے امور کا تذکرہ کیا ہے، یہ تو بیسویں صدی میں ایجاد ہوئے تھے تاہم انہوں نے ہزار سال پہلے ان کی توضیح پیش کی تھی۔ اسی لیے علمی تخصص اور اس میں دلچسپی کا اہتمام، مذاہب کے تقابل میں ان کا معروضی بیان وغیرہ ہمیشہ قابل ذکر رہا ہے۔ تاہم شلبیؒ نے ان معاملات پر توجہ نہیں دی۔

نتائج:

- تقابلِ مذاہب کا شعبہ درحقیقت انسانی علوم کا حصہ ہے۔ متقدمین اور معاصر مسلم علماء اس کے مطالعہ، تنقید اور تجزیے میں مصروف رہے ہیں۔ اس طرح کے مطالعہ میں ان کی دلچسپی کی وجہ اسلامی فکر اور عقیدہ ہے۔
- تقابلِ مذاہب کے شعبے کا مطالعہ مسلم علماء نے معروضی طریقہ کار کے مطابق کیا جو اسلام کی رواداری اور انصاف کی عکاسی کرتا ہے۔ مذاہب کے حوالے سے مسلم علماء کی طرف سے کئے گئے معروضی مطالعات مذہبی اور نظریاتی ترغیبات سے متاثر تھے۔
- معروضیت دور حاضر کی ایک جدید اصطلاح ہے، جس کا اسلامی تراث میں ذکر نہیں ہوا ہے، تاہم اس اصطلاح کے تحت جس طرح کے مضامین بیان ہوتے ہیں، ان کو اسلامی تراث میں بیان کیا گیا ہے۔
- معروضیت سے مراد ایسا طریقہ کار جو محقق کو اس قابل بناتا ہے وہ سچائی تک رسائی کے لیے حقائق کو ویسے ہی دیکھے جیسا کہ وہ ہیں۔ جذباتیت، تعصب، ذاتی مداخلت، بیرونی اثرات اور عقائد و نظریات کے خول میں رہ کر کسی شے کا مطالعہ کرنا حق و انصاف سے منحرف کر دیتا ہے۔ لہذا مذاہب اور انسانیت کے مطالعہ میں معروضیت پر مبنی مطالعہ سب کے لیے قابل قبول ہوتا ہے۔
- انسانی علوم میں معروضی طریقہ کار اور مظاہریاتی مطالعہ کی بنیادوں کو مسلم علماء جیسے فلسفی ابوالحسن العامریؒ اور ماہر فلکیات ابوریحان البیرونی نے قائم کر کے اس کو استحکام بخشا تھا۔ العامریؒ نے وضاحت کی کہ مذاہب کا تقابلی مطالعہ دو اصولوں کے مطابق ہونا چاہیے۔

اول: اصل کا اصل اور فرع کا فرع کے ساتھ تقابل کیا جائے۔ **دوم:** ایک دین میں جس اصل اور فرض پر اکثریت متفق ہو اس کا دوسرے دین کے اُس اصل اور فرض کے ساتھ تقابل کیا جائے جس پر اس دین کے متبعین متفق ہوں۔ یہ دو اصول معروضیت کی اساس اور بنیاد ہیں۔ البیرونی کا کہنا ہے کہ تقابلی مطالعہ مذہب کی خالص توضیح، تنقید اور تخریب سے پاک الگ تھلگ بیانیہ پر مبنی ہونا چاہیے۔ یہ اصول رجحاناتی مطالعہ کی بنیادوں میں سے ایک ہے۔

- مذاہب کے مطالعہ میں معروضیت اور مظاہریاتی مطالعہ کے لیے مسلم علماء کا سب سے قریب ترین منہج وضاحتی اور تجزیاتی تحریروں کا منہج ہے۔
- العامریؒ اور شلبیؒ، دونوں نے استقرائی، توضیحی، تاریخی، تنقیدی، تجزیاتی، تحلیلی، وضاحتی ورجحاناتی، اور معروضی مناہج کا استعمال کیا ہے۔
- ان کے درمیان جو فرق ہے اس کا تعلق تنقیدی و تجزیاتی منہج سے ہے۔ ابو الحسن العامریؒ، نقلی و عقلی دونوں طرح کے مناہج کا استعمال کرتے ہیں۔ تاہم شلبیؒ، صرف نقلی استدلال پر اکتفاء کرتے نظر آتے ہیں۔ العامریؒ، مطالعہ مذہب میں مختلف علوم کو بھی ایک انسائیکلوپیڈیا کے طور پر اپنی کتاب میں ذکر کرتے ہیں تاہم شلبیؒ ایسا نہیں کرتے۔